

تفسیر القرآن

الشعراء

نام | آخری رکوع کی آیت وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | مضمون اور انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں کہ اس سورے کا زمانہ نزول مکہ کا دورِ متوسط ہے۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ پہلے سورہ طہ نازل ہوئی، پھر واقفہ اور اس کے بعد الشعراء (روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۶۴)۔ اور سورہ طہ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

موضوع اور مباحث | تقریر کا پس منظر یہ ہے کہ کفار مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تذکیر کا مقابلہ پیہم محمود و انکار سے کر رہے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے چلے جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ تم نے ہمیں کوئی نشانی تو دکھائی ہی نہیں، پھر یہیں کیسے یقین آئے کہ تم نبی ہو کبھی آپ کو شاعر اور کاہن قرار دے کر آپ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اڑا دینے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی یہ کہہ کر آپ کے مشن کا استخفاف کرنے کہ ان کے پیرواؤں چنٹان نوجوان ہیں، یا پھر ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات کے لوگ، حالانکہ اگر اس تعلیم میں کوئی جان ہوتی تو اشراف قوم اور شیوخ اس کو قبول کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غلطی اور توحید و معاد کی صداقت سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، مگر وہ سبٹ دھرمی کی انت نئی صورتیں اختیار کرتے نہ تھکتے تھے یہی چیز آنحضرت کے لیے سوبانِ روح بنی ہوئی تھی اور اس غم میں آپ کی جان گھلی جاتی تھی۔

ان حالات میں یہ سورت نازل ہوئی۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تم ان کے پیچھے

اپنی جان کیوں گھلاتے ہو۔ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بٹ دھرم ہیں، سمجھانے سے نہیں ماننا چاہتے، کسی ایسی نشانی کے طالب ہیں جنہیں ہر سستی ان کی گردنیں جھکاوے، اور وہ نشانی اپنے وقت پر جب آجائے گی تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جو بات انہیں سمجھائی جا رہی تھی وہ کیسی برحق تھی۔ اس تمہید کے بعد دسویں رکوع تک جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ طالب حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن بٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے ہیں، نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاء کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اُس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آکر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی بٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفار مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں:

اول یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر ہر صاحب عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دکھیں، قوم نوح نے دکھیں، عاد اور ثمود نے دکھیں، قوم لوط اور اصحاب المائکہ نے دکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے۔ ان کی جتنی ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے ایمان نہ لانے کے لیے ان کے جیلے اور بہانے یکساں تھے اور آخر کار ان کا انجام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاء کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و حکمت

کا انداز ایک تھا۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں اور کفار خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس نمونے سے ملتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

تیسری بات جو بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا زبردست، قادر و توانا بھی ہے اور رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود ہی طے کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔

آخری رکوع میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اگر نشانیاں ہی دیکھنا چاہتے ہو تو آخر وہ خوفناک نشانیاں دیکھنے پر کیوں اصرار کرتے ہو جو تباہ شدہ قوموں نے دیکھی ہیں۔ اس قرآن کو دیکھو جو تمہاری اپنی زبان میں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا یہ کلام کسی شیطان یا جن کا کلام ہو سکتا ہے؟ کیا اس کلام کا پیش کرنے والا نہیں کاہن نظر آتا ہے؟ کیا محمد اور ان کے اصحاب تمہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر اور ان کے ہم مشرب ہوا کرتے ہیں؟ ضد ضد کی بات دوسری ہے، مگر اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔ اگر دلوں میں تم خود جانتے ہو کہ کہانت اور شاعری سے اس کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ تم ظلم کر رہے ہو اور ظالموں کا سا انجام دیکھ کر رہو گے۔

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

ط۔ س۔ جم۔ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔

یعنی یہ آیات، جو اس سورے میں پیش کی جا رہی ہیں، اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف کھول کر بیان کرتی ہے۔ جسے پڑھ کر بائسن کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس چیز کی طرف بلاتی ہے، کس چیز سے روکتی ہے، کسے حق کہتی ہے اور کسے باطل قرار دیتی ہے۔ ماننا یا نہ ماننا الگ بات ہے، مگر کوئی شخص یہ بہانہ کبھی نہیں بنا سکتا کہ اس کتاب کی تعلیم اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ اس سے یہ معلوم ہی نہ کر سکا کہ وہ

اُسے محمدؐ، شاید تم اس غم میں اپنی جان کھودو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو اُس کو کیا چیز چھوڑنے اور کیا اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

قرآن کو المکتاب المبین کہنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا کتاب الہی ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اس کی زبان، اس کا بیان، اس کے مضامین، اس کے پیش کردہ حقائق، اور اس کے حالات نزول، سب کے سب صاف صاف دلالت کر رہے ہیں کہ یہ خداوند عالم ہی کی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے ہر فقرہ جو اس کتاب میں آیا ہے ایک نشانی اور ایک معجزہ (آیت) ہے۔ کوئی شخص عقل و غرور سے کام لے تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کرنے کے لیے کسی اور نشانی کی حاجت نہیں، کتاب مبین کی یہی آیات و نشانیاں اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ مختصر تمہیدی فقرہ اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے اُس مضمون کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو آگے اس سورہ میں بیان ہوا ہے۔ کفار مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگتے تھے تاکہ اس نشانی کو دیکھ کر انہیں اطمینان ہو کہ واقعی آپ یہ پیغام خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر حقیقت میں کسی کو ایمان لانے کے لیے نشانی کی طلب ہے تو کتاب مبین کی یہ آیات موجود ہیں۔ اسی طرح کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ آپ شاعر یا کاہن ہیں۔ فرمایا گیا کہ یہ کتاب کوئی چیتاں اور سمٹا تو نہیں ہے۔ صاف صاف مکمل کر اپنی تعلیم پیش کر رہی ہے۔ خود ہی دیکھ لو کہ یہ تعلیم کسی شاعر یا کاہن کی ہو سکتی ہے؟

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ کہف میں فرمایا فَذَعَبَكَ بِأَخِيكَ لَقَسْتَكَ عَلَىٰ أَثَرِ هَمِيرٍ لَمْ يَوْمِتُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَشَقَّٰ شَيْبًا ثُمَّ ان کے پیچھے غم کے ماٹے اپنی جان کھودینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لاتے (رکوع ۱) اور سورہ فاطر میں ارشاد ہوا ذَلَّاتُ ذَهَبٍ لَقَسْتَكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَاتٍ۔ ان لوگوں کی حالت پر رنج و افسوس میں تمہاری جان نہ گھٹے (رکوع ۲)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اپنی قوم کی گمراہی و ضلالت، اس کی اخلاقی پستی، اس کی ہیٹ دھرمی اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی فراغت کا رنگ دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم برسوں اپنے شب و روز کس دل گزارو جہاں گسل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔

آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ ان لوگوں
-بج کے اصل معنی پوری طرح ذبح کر ڈالنے کے ہیں۔ **بَاخِجْ نَفْسَكَ** کے لغوی معنی یہ ہونے کہ تم اپنے
آپ کو قتل کیسے دے رہے ہو۔

تلاہ یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و طاعت کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے
اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت
سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے
کہ لوگ عقل و خود سے کام لے کر ان آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتاب الہی میں پیش کی گئی ہیں، جو
تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی
دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور اس کے خلاف جو عقیدے اور طریقے
رایج ہیں وہ باطل ہیں تو جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان اور ترک
باطل اور اتباع حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے
اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط جس راہ پر
بھی وہ جانا چاہے جاسکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر اور شر کے دونوں رجحانات رکھ دیے
ہیں، مجبوراً و تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں، شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے،
نبوت اور وحی اور دعوت خیر کا سلسلہ راہ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے، اور انسان کو انتخاب
راہ کے لیے ساری مناسب حال صلاحیتیں دیکر اس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا
راستہ اختیار کرنا ہے یا ایمان و طاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی نوبت ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی
تذبیہ اختیار فرمائے جو انسان کو ایمان اور اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو
نشانی نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا حاجت تھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا
تھا جس میں کفر، نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدا ہوتا تو
ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا **وَلَوْ شَاءَ**

کے پاس رحمان کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں، غمگین ہیں ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں۔

رَبُّكَ لَأَمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُنكَرُهَا النَّاسُ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۚ اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گا؟ (یونس رکوع ۱۰)۔ اور وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّجَعْنَا رَبُّكَ إِلَىٰ ذِكْرِهِمْ ۚ اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا۔ وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا: (ہود رکوع ۱۰)۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحات ۳۱۳ و ۳۱۴۔

لکھ یعنی جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ معقول طریقوں سے ان کو سمجھانے اور راہِ راست دکھانے کی جو کوشش بھی کی جائے اس کا مقابلہ بے رنجی و بے اتفاقی سے کریں ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں زبردستی ایمان اتارنے کے لیے آسمان سے نشانیاں نازل کی جائیں، بلکہ ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ جب ایک طرف انہیں سمجھانے کا حق پورا پورا ادا کر دیا جائے اور دوسری طرف جب وہ بے رنجی سے گزر کر قطعی اور کھلی تکذیب پر، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت کا مذاق اڑانے پر اتر آئیں، تو ان کا انجام بد انہیں دکھا دیا جائے۔ یہ انجام بد اس شکل میں بھی نہیں دکھایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں وہ حق ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساری مزاحمتوں کے باوجود غالب آجائے جس کا وہ مذاق اٹھاتے تھے۔ اس کی شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان پر ایک عذابِ الیم نازل ہو جائے اور وہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیے جائیں۔ اور وہ اس شکل میں بھی ان کے سامنے آسکتا ہے کہ چند سال اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر وہ موت کی ناگزیر منزل سے گزریں اور آخر کار ان پر ثابت ہو جائے کہ سراسر باطل تھا جس کی راہ میں انہوں نے اپنا تمام سرمایہ زندگانی بھیا دیا اور حق وہی تھا جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے تھے اور جسے یہ عمر بھر ٹھٹھوں میں اڑتے رہے۔ اس انجام بد کے سامنے آنے کی چونکہ بہت سی شکلیں ہیں اور

اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی جانداروں کی نشانیوں کو پیدا کیا ہے، تیسرا اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر انہوں نے دیکھے نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

مختلف لوگوں کے سامنے وہ مختلف صورتوں سے آسکتا ہے اور آتا رہا ہے، اسی لیے آیت میں نبیؐ کے بجائے انبیاء و بصیرت جمع فرمایا گیا، یعنی جس چیز کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں اس کی حقیقت آخر کار بہت سی مختلف شکلوں میں انہیں معلوم ہوگی۔

۵۰ یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، انہیں کھول کر ذرا اس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظام کائنات کی جو حقیقت (توحید اللہ) انبیاء و علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے، یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، جن مادوں اور قوتوں کی بدولت اُگ رہی ہیں، جن توانیوں کے تحت اُگ رہی ہیں، پھر ان کے خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی ان گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک اُمتی ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبہ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو، اگر وہ کسی بٹ دھری اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟

انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جبکہ تمہارے رب نے موسیٰ کو دکھانا عالم قوم
 ملا یعنی اس کی قدرت تو ایسی زبردست ہے کہ کسی کو سزا دینا چاہے تو پل بھر میں مٹا کر رکھ دے،
 مگر اس کے باوجود یہ سراسر اس کا رحم ہے کہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا
 ہے، سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دینے جانتا ہے، اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توہ پر محاف
 کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

یہ اوپر کی مختصر تمہیدی تقریر کے بعد اب تاریخی بیان کا آغاز ہو رہا ہے جس کی ابتدا حضرت موسیٰ
 اور فرعون کے قصے سے کی گئی ہے۔ اس سے خاص طور پر جو سبق دینا مقصود ہے وہ یہ کہ:

اولاً، حضرت موسیٰ کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا وہ ان حالات کی بر نسبت بدرجہا زیادہ
 سخت تھے جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ دہش پیش تھا۔ حضرت موسیٰ ایک عظیم قوم کے فرزند تھے
 جو فرعون اور اس کی قوم سے بڑی طرح دہی ہوئی تھی، بخلاف اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے
 ایک فرد تھے اور آپ کا خاندان قریش کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ بالکل برابر کی پوزیشن رکھتا
 تھا۔ حضرت موسیٰ نے خود اس فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی اور ایک قتل کے الزام میں دس برس
 روپوش رہنے کے بعد انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اسی بادشاہ کے دربار میں جا کھڑے ہوں جس کے ہاں سے
 وہ جان بچا کر فرار ہوئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کسی نازک صورت حال سے سابقہ نہ تھا پھر
 فرعون کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت و سلطنت تھی۔ قریش کی طاقت کو اس
 کی طاقت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود فرعون حضرت موسیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آخر کار
 ان سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کفار قریش کو یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ جس کی پشت پر اللہ کا
 ہاتھ ہو اس کا مقابلہ کر کے کوئی جیت نہیں سکتا۔ جب فرعون کی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کچھ
 پیش نہ گئی تو تم بیچارے کیا ہستی ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بازی جیت لے جاؤ گے۔
 ثانیاً، جو نشانیاں حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے فرعون کو دکھائی گئیں اس سے زیادہ کہنی
 نشانیاں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ پھر نذر اہل آدمیوں کے جمع میں فرعون ہی کے چیلنج پر صلی اللہ علیہ

کے پاس جا۔ فرعون کی قوم پاس سے۔ کیا وہ نہیں ڈرتے؟ اُس نے عرض کیا

جادوگروں سے مقابلہ کر کے یہ ثابت بھی کر دیا گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ دکھا رہے ہیں وہ جادو نہیں ہے۔ فنِ سحر کے جو ماہرین فرعون کی اپنی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور اُس کے اپنے بلائے ہوئے تھے، انہوں نے خود یہ تصدیق کر دی کہ حضرت موسیٰ کی لالچی کا اثر دیا بن جانا ایک حقیقی تغیر ہے اور یہ صرف خدائی معجزے سے ہو سکتا ہے، جادوگری کے ذریعہ سے ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ ساحروں نے ایمان لاکر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس امر میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ چھوڑی کہ حضرت موسیٰ کی پیش کردہ نشانی واقعی معجزہ ہے، جادوگری نہیں ہے۔ لیکن اس پر بھی جو لوگ ہٹ دھرمی میں مبتلا تھے، انہوں نے نبی کی صداقت تسلیم کر کے نہ دی۔ اب تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہارا ایمان لانا درحقیقت کوئی حسی معجزہ اور آدنی نشان دیکھنے پر موقوف ہے۔ تعصب، حمیت جاہلیہ، اور مفاد پرستی سے آدمی پاک ہو اور کھلے دل سے حق اور باطل کا فرق سمجھ کر غلط بات کو چھوڑنے اور صحیح بات قبول کرنے کے لیے کوئی شخص تیار ہو تو اس کے لیے وہی نشانیاں کافی ہیں جو اس کتاب میں اور اس کے لانے والے کی زندگی میں اور خدا کی وسیع کائنات میں ہر آنکھوں والا ہر وقت دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ ایک ہٹ دھرم آدمی جسے حق کی جستجو ہی نہ ہو اور اغراض نفسانی کی بندگی میں مبتلا ہو کر جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ کسی ایسی صداقت کو قبول نہ کرے گا جس سے اسکی اغراض پر ضرب لگتی ہو، وہ کوئی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے گا خواہ زمین اور آسمان ہی اس کے سامنے کیوں نہ آتے دیئے جائیں۔

مثلاً، اس ہٹ دھرمی کا جو انجام فرعون نے دیکھا وہ کوئی ایسا انجام تو نہیں ہے جسے دیکھنے کے لیے دوسرے لوگ بے تاب ہوں۔ اپنی آنکھوں سے خدائی طاقت کے نشانات دیکھ لینے کے بعد جو نہیں مانتے وہ پھر ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب کیا تم لوگ اس سے عبرت

اے میرے رب، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو ٹھیلادیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں۔ اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھیجے۔

حاصل کرنے کے بجائے اس کا فرائض چھینا ہی پسند کرتے ہو؟

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۳ تا ۷۴۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

یہ انداز بیان قوم فرعون کے انتہائی ظلم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا تعارف ہی ظالم قوم کے لقب سے کر یا گیا ہے۔ گویا اس کا اصل نام ظالم قوم ہے اور قوم فرعون اس کا ترجمہ و تفسیر۔

یعنی اے موسیٰ، دیکھو کبھی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مختار مطلق سمجھتے ہوئے دنیا میں ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور اس بات سے بے خوف ہیں کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان پر سر کرنے والا ہے۔

۱۔ سورہ طہ رکوع ۲، اور سورہ قصص رکوع ۴ میں اس کی جو تفصیل آئی ہے اسے ان آیات کے ساتھ

ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اول تو اتنے بڑے مشن پر نہا جاتے ہوئے گھبراتے تھے (میرا سینہ گھٹتا ہے کے الفاظ اسی کی نشان دہی کرتے ہیں) دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ روانی کے ساتھ تقریر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ حضرت ہارون کو ان کے ساتھ مددگار کی حیثیت سے نبی بنا کر بھیجا جائے کیونکہ وہ زیادہ زبان آور ہیں، جب ضرورت پیش آئے گی تو وہ ان کی تائید و تصدیق کر کے ان کی پشت مضبوط کریں گے۔ ممکن نہیں کہ ابتداء حضرت موسیٰ کی درخواست یہی رہی ہو کہ آپ کے بجائے حضرت ہارون کو اس منصب پر مامور کیا جائے، اور بعد میں جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ مرضی الہی آپ ہی کو مامور کرنے کی ہے تو پھر یہ درخواست کی ہو کہ انہیں آپ کا وزیر اور مددگار بنایا جائے۔ یہ شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰ ان کو وزیر بنانے کی درخواست نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کر رہے ہیں کہ قَارِئِلْ اِلٰی هَارُوْنَ، آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں۔ اور سورہ طہ میں وہ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وَاجْعَلْ لِيْ وَزِيْرًا مِّنْ اٰهْلِیْ هَارُوْنَ اَخِيْ، میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر مقرر فرما دیجیے میرے بھائی ہارون کو۔ نیز سورہ قصص میں وہ یہ عرض کرتے ہیں کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اٰهْلِیْ هَارُوْنَ اَخِيْ هَارُوْنَ هُوَ اَنْصَحُ مِّنِّيْ لَسَانًا قَارِئِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِيْ، میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہیں لہذا آپ انہیں مددگار

اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ فرمایا: ہرگز نہیں، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو، ہم کو رب العالین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔“

کے طور پر میرے ساتھ بھیجے تاکہ وہ میری تصدیق کریں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ مؤخر الذکر دونوں درخواستیں بعد کی تھیں، اور پہلی بات وہی تھی جو حضرت موسیٰ سے اس سورے میں نقل ہوئی ہے۔

بائبل کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے قوم فرعون کی تکذیب کا خوف اور اپنی زبان کے گندہ ہونے کا غم پیش کر کے یہ منصب قبول کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا: اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بطور خود حضرت ہارون کو ان کے لیے مددگار مقرر فرما کر انہیں اس بات پر راضی کیا کہ دونوں بھائی مل کر فرعون کے پاس جائیں (خروج باب ۴- آیات ۱ تا ۱۷)۔

یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو سورہ ممتنع رکوع ۲ میں بیان ہوا ہے حضرت موسیٰ نے قوم فرعون کے ایک شخص کو ایک اسرائیلی سے لڑتے دیکھ کر ایک گھونسا مار دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ کو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کی اطلاع قوم فرعون کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدلا لینے کی تیاری کر رہے ہیں تو وہ ملک چھوڑ کر مدین کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ اب جو آٹھ دس سال کی روپوشی کے بعد یکایک انہیں یہ حکم دیا گیا کہ تم پیغام رسالت لیکر اسی فرعون کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ پہلے سے موجود ہے تو حضرت موسیٰ کو بجا طور پر یہ خطرہ ہوا کہ پیغام سننے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ تو مجھے اس قتل کے الزام میں پھانس لے گا۔

۱۱۔ نشانوں سے مراد عصا اور ید بیضا کے معجزے ہیں جن کے عطل کیے جانے کی تفصیل سورہ ظہر رکوع ۱، سورہ قتل رکوع ۱، اور سورہ ممتنع رکوع ۴ میں بیان ہوئی ہے۔

۱۲۔ حضرت موسیٰ و ہارون کی دعوت کے دو جزو تھے۔ ایک، فرعون کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، جو تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصود رہا ہے۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو فرعون کے بند غلامی سے نکلانا، جو خصوصاً طور پر انہی دونوں حضرات کا مشن تھا۔ قرآن مجید میں کسی جگہ صرف پہلے جزو کا ذکر کیا گیا ہے (مثلاً سورہ نازعات میں) اور کسی جگہ صرف دوسرے جزو کا۔

فرعون نے کہا: "کیا ہم نے مجھ کو اپنے ہاں پتھر سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے، اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کہ کر گیا، تو بڑا احسان فرماؤں آدی ہے۔" موسیٰ نے جواب دیا: "اس وقت وہ کام میں نے نادرہ شے میں کر دیا تھا۔ پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرمایا۔ ہاں تمہارا احسان جو تو نے مجھ پر بتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے نبی اسرائیل کو غلام بنایا تھا۔"

۱۱۱۔ اس سے ایک اشارہ اس خیال کی تائید میں نکلتا ہے کہ یہ فرعون وہ فرعون تھا جس کے گھر میں حضرت موسیٰ نے پرورش پائی تھی، بلکہ یہ اس کا بیٹا تھا۔ اگر یہ وہی فرعون ہوتا تو بتا دیتے تھے پالا تھا۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ جیسے ہاں تو رہا ہے اور مجھ نے تیری پرورش کی ہے۔ اس لئے تو تفصیل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم صفحہ ۶۶ و ۶۷۔

۱۱۲۔ اشارہ ہے اسی واقعہ قتل کی طرف جو حضرت موسیٰ سے سرزد ہو گیا تھا۔

۱۱۳۔ اصل الفاظ میں "واناص العنایین" میں اس وقت منکالت میں تھا یا نہیں اس وقت یہ کام منکالت کی حالت میں کیا تھا۔ یہ لفظ منکالت لازماً گراہی کا ہی ہم معنی نہیں ہے بلکہ عربی زبان میں اسے "انقضیت" نادانی، خطا، نسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ سورہ قصص میں بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے سے یہاں منکالت بمعنی خطا یا نادانستگی ہی بینا زیادہ صحیح ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس جملے کو ایک اسرائیلی بزرگ کو دیکھ کر صرف ایک گھونسا مارا تھا۔ ظاہر ہے کہ گھونسے سے بالعموم آدمی فرما نہیں ہے، قتل کی نیت سے گھونسا مارنا جائز ہے اتفاق کی بات ہے کہ اس سے وہ شخص مر گیا۔ اس لیے صیغہ صورت واقعہ یہی ہے کہ یہ قتل عین جملے قتل تھا۔ قتل ہوا ضرور، مگر بالادہ قتل کی نیت سے نہیں ہوا، نہ کوئی ایسا آدمی نہ تھا۔ استعمال کیا گیا جو قتل کی فرض سے استعمال کیا جاتا ہے یا جس سے قتل واقع ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۱۱۴۔ یعنی علم و دانش اور پروانہ نبوت حکم کے معنی حکمت و دانش کے بھی ہیں، اور اس سبب اتقاندار (دلیل اللہ) کے بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف نبی کو مالک جاتی ہے، جس کی بنا پر وہ اختیار کے ساتھ لوگوں کو حکم دیتی ہے۔ گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آیا، تو نے نبی اسرائیل پر غلام نہ دیا یا ہوتا ہے جسے ہی

فرعون نے کہا "اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟"

موسیٰ نے جواب دیا "آسمانوں اور زمین کا رب، اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو۔"

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا "سنئے ہو؟"

موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے اُن آبا و اجداد کا رب بھی جو گنڈر چکے میں۔"

ظلم کی وجہ سے قومیری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا۔ اس لیے اس پرورش کا احسان بخانا مجھے زیب نہیں دیتا۔

۱۹۔ بیچ میں تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے آپ کو رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کرنے فرعون کو وہ پیغام پہنچایا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔ یہ بات آپ کے آپ ظاہر ہے کہ نبی نے ضرور وہ پیغام پہنچا دیا ہو گا جس پر وہ مامور کیے گئے تھے، اس لیے اس کا ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اسے چھوڑ کر اب وہ گفتگو نفل کی جاتی ہے جو اس پیغام کی تبلیغ کے بعد فرعون اور موسیٰ کے درمیان ہوئی۔

۲۰۔ یہ اُس کا سوال حضرت موسیٰ کے اس قول پر تھا کہ میں رب العالمین (تمام جہان والوں کے مالک و مآقا اور فرمانروا) کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تو نبی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس پیغام کی نوعیت صریح طور پر سیاسی تھی۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ حضرت موسیٰ جس کی نمائندگی کے مدعی ہیں وہ سارے جہان والوں پر حکایت و اقتدارِ اعلیٰ رکھتا ہے اور فرعون کو اپنا تابع قرار دے کر اس کے دائرہ حکومت و اقتدار میں ایک بالائے فرما زوا کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مداخلت کر رہا ہے بلکہ اس کے نام پر فرمان بھیج رہا ہے کہ تو اپنی رعایا کے ایک حصے کو میرے نامزد کردہ نمائندے کے حوالے کر دے تاکہ وہ اسے تیری سلطنت سے باہر نکال لے جائے۔ اس پر فرعون پوچھتا ہے کہ یہ سارے جہان والوں کا مالک و فرمانروا ہے تو نون جو مصر کے بادشاہ کو اس کی رعایا کے ایک وئی فرد کے ہاتھوں یہ حکم بھیج رہا ہے؟

۲۱۔ یعنی اس زمین پر بسنے والے کسی مخلوق اور فانی مدعی ملکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے۔ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک فرمانروا ہے

فرعون نے (حاضرین سے) کہا: تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔“

موسیٰ نے کہا: مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں“ فرعون نے کہا: ”اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے پڑے مٹر رہے ہیں۔“

تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی چاہیے کہ سارے جہان داروں کا رب کون ہے۔

۱۲۷ یعنی میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے، اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں۔ تمہارا یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ و دادا جن فرعونوں کو رب بناٹے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں۔ صرف اُس رب کی حاکمیت و فرمانروائی ماننا ہوں جو آج بھی تمہارا اور اس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ و دادا گذر چکے ہیں ان سب کا رب بھی تھا۔

۱۲۸ یعنی مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر قائل ہیں تو خود سوچیں کہ حقیقت میں رب یہ بیچارا فرعون ہے جو زمین کے ایک ذرے سے قبے پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مہر سمیت ہر اس چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے۔ میں تو فرمانروائی اسی کی مانتا ہوں اور اسی کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔ لہذا اس گفتگو کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی سمجھو گناہ صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا

یعنی یہ کہ اُسے بس پوجا پاٹ اور زدن و نیا زکا استحقاق پہنچتا ہے، اور اپنے فوق الفطری غلیظ اتار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس سے استدعا و استعانت کے لیے دعائیں مانگیں، لیکن کسی معبود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملات دنیا میں وہ جو حکم دیا ہے اسے اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی

کو قانون بزرگان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجاری فرمانرواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم تمہارا مطلق ہیں، کسی معبود کو ہماری سیانت اور ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ دنیوی حکومتوں اور بادشاہوں کے انبیاء و کسب السلام و امن کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے۔ انہوں نے ان سے خداوندی عالم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرنے کی کوشش کی ہے اور

موسیٰ نے کہا "اگر چہ میں نے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟"
 فرعون نے کہا "اچھا تو بے آگے تو سچا ہے۔"

یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں بلکہ انہوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھہرایا ہے جو ان کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے اس تشریح سے فرعون کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر معاملہ صرف پوجا پاٹ اور مذہب و نیا زکا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ موسیٰ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ رب العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں مگر صرف اسی معنی میں تو جینی العبادت کی دعوت حضرت موسیٰ نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دین آبادی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰ سے کہتا کہ میرے مذہب کے پندوں سے مناظرہ کر لو۔ لیکن جس چیز نے اسے غضناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ نے رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم بزرگ کا پیغامبر اگر اس سے اطاعت امر کا مطالبہ کر رہا ہے اس معنی میں وہ اپنے اوپر کسی کی سیاسی و قانونی بزرگی ماننے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکم بزرگ مانے۔ اسی لیے اس نے پہلے "رب العالمین" کی اصطلاح کو پہنچایا، کیونکہ اس کی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبودیت کا نہیں بلکہ کھلا کھلا سیاسی اقتدار اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا پھر جب حضرت موسیٰ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس رب العالمین کا پیغام وہ لائے ہیں وہ کون ہے تو اس نے صاف صاف دھکی ویدی کہ ملک مصر میں تم نے میرے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام بھی بیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

۵۱۰ یعنی کیا تو اس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جبکہ میں اس امر کی ایک صریح علامت پیش کر دوں کہ میں واقعی اس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب العالمین رب السموات والارض اور رب المشرق والمغرب ہے؟
 ۵۱۱ حضرت موسیٰ کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا۔ وہ فوق الفطری معنوں میں اللہ کے الہ الالہہ ہونے کو مانتا تھا اور دوسرے مشرکین کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اُس کی قدرت سب دیوتاؤں سے بڑھتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ اگر تجھے میرے مامور اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اسی کا بھیجا ہوا ہوں۔

۱۷۷ (اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اثر دیا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) پھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔^۸ فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا: "یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ اب تیار ہو کر تم کو کیا حکم دیتے ہو؟"

اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی نشانی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہمتی یا اس کے مالک کائنات ہونے ہی میں کلام ہوتا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ نشانی کی بات تو اسی صورت میں درمیان آ سکتی تھی جبکہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کا قیام مطلق ہونا تو مسلم ہو، اور عبت اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰ اس کے نیچے ہوئے ہیں یا نہیں۔

۱۷۸ قرآن مجید میں کسی جگہ اس کے لیے حنیۃ (سانپ) اور کسی جگہ جحان (جو بالعموم چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسے ثعبان (اثر دہا) کہا جا رہا ہے۔ اس کی توجیہ امام رازی اس طرح کرتے ہیں کہ حنیۃ عربی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور ثعبان کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ جتانے اعتبار سے وہ اثر ہے کی طرح تھا۔ اور جحان کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا کہ اس کی پھرتی اور تیزی چھوٹے سانپ جیسی تھی۔

۱۷۹ بعض مفسرین نے یہودی روایات سے متاثر ہو کر بیضاد کے معنی "سفید" کیے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بغل سے نکلتے ہی بھلا چمکا ہاتھ برس کے مریض کی طرح سفید ہو گیا۔ لیکن ابن جریر، ابن کثیر، زحشری، رازی، ابو اسود عمادی، نسوی اور دوسرے بڑے بڑے مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں بیضاد بمعنی روشن اور چمکا رہا ہے۔ جو نبی کہ حضرت موسیٰ نے بغل سے ہاتھ نکالا ایک سارا ماحول جگمگا اٹھا اور یوں محسوس ہوا جیسے سورج نکل آیا ہے۔

۱۸۰ دونوں معجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یا تو ایک لمحہ پہلے وہ اپنی رحمت کے ایک فرد کو بربر بار رسالت کی باتیں اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتے دیکھ کر پاگل قرار دے رہا تھا، کیونکہ اس کے نزدیک ایک غلام قوم کے فرد کا اس جیسے باجبروت بادشاہ کے حضور اسی جسارت کہ نہا یا گل پن کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا، اور اسے وہی دے ہاتھ نہ گم کرنے میرے سوا کسی کو معبود مانا تو جبل میں ٹر ٹر کر مار دوں گا، یا اب ان نشانیوں کو دیکھتے ہی اس پر ایسی ہیبت جاری ہوئی کہ اسے اپنی بادشاہی اور اپنا ملک چھیننے کا خطرہ لاحق ہو گیا اور بدحواسی میں اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں بھرے دربار میں اپنے نوکر کے سامنے کیسی تے کی باتیں کر رہا ہوں۔ بنی اسرائیل جیسی دینی ہوئی قوم کے دو افراد وقت کے سب سے بڑے طاقتور بادشاہ کے

انہوں نے کہا "اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں میں آدمی بھیجیے کہ ہر مہینے جاؤ گے
کو آپ کے پاس لے آئیں۔"

چنانچہ ایک روز مقررہ وقت پر جاؤ گے اور لوگوں سے کہا گیا "تم اجتماع میں چلو گے؟"

سامنے کھڑے تھے۔ کوئی لاؤنٹکر ان کے ساتھ نہ تھا کوئی جان ان کی قوم میں نہ تھی کسی بغاوت کا نام و نشان تک ملک کے کسی گوشے
میں نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی نشت پر نہ تھی۔ اس حالت میں صرف ایک لاطھی کا آؤ ہانٹنے دھکے
اور ایک ہاتھ کھینچنے دیکھ کر یکایک اس کا بیخ اٹھا کہ یہ دو بے سر سامان آدمی میری سلطنت کا تختہ الٹ دینگے اور پورے حکمراں
طبقے کو اقتدار سے بے دخل کر دیں گے، آخر کیا معنی رکھتا اس کا یہ کہنا کہ شیخ جاؤ گے تو سے ایسا لڑنا لگا مزید جو سی کی دلیل جاؤ گے زور سے
دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہوا، کوئی ملک فتح نہیں ہوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جاؤ گے تو اس کے اپنے ملک میں موجود
تھے اور بڑے بڑے کشتے دکھا سکتے تھے۔ مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کے انعام لینے سے بڑھ کر ان کی کوئی ادعات نہیں ہے۔
سلطنت تو کجا، وہ بیچارے تو سلطنت کے کسی پولیس کانسٹیبل کو بھی چیلنج کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

۳۲ یہ نقرہ فرعون کی مزید بدجواری کو ظاہر کرتا ہے۔ کہاں تو وہ الہ بنا ہوا تھا اور یہ سب اس کے بندے تھے کہا
اب الہ صاحب مانے خوف کے بندوں سے لہ جھوڑے ہیں کہ تمہارا حکم کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گو یا وہ یہ کہہ رہا تھا
کہ میری عقل تو اب کچھ کام نہیں کرتی، تم بتاؤ کہ اس خطرے کا مقابلہ میں کیسے کروں۔

۳۳ سوۃ ظہر میں گزر چکا ہے کہ اس مقابلے کے لیے قطبیوں کی قومی عید کا دن (یوم الزفیر) مقرر کیا گیا تھا تاکہ ملک
کے گوشے گوشے سے میلوں ٹھیلوں کی خاطر آنے والے سب لوگ عظیم الشان "ڈنگل" دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں، اور اس کے لیے
وقت بھی دن چڑھے کھلے ہوا تھا تاکہ روز روشن میں سب کی آنکھوں کے سامنے فریقین کی طاقت کا مظاہرہ ہو اور روشنی کی کمی کے
باعث کوئی شک و شبہ پیدا ہونے کی گنجائش نہ رہے۔

۳۴ یعنی صرف اعلان و اشتہار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آدمی اس غرض کے لیے پھوڑے گئے کہ لوگوں کو اس آس کر بے اختیار
دیکھنے کے لیے لائیں۔ اس معلوم ہوتا ہے کہ جبے دربار میں جو معجزات حضرت موسیٰ نے دکھائے تھے ان کی خبر عام لوگوں میں پہنچ چکی تھی
اور فرعون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس سے ملک کے باشندے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس نے چاہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ
جمع ہوں اور خود دیکھ لیں کہ لاطھی کا سانپ بن جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہمارے ملک کا ہر جاؤ گے یہ کہاں دکھا سکتا ہے۔

شاید کہ ہم جادو گروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے۔^{۲۳}
جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا: "ہیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے۔"
اس نے کہا: "ہاں، اور تم تو اس وقت معززین میں شامل ہو جاؤ گے۔"^{۲۴}

۲۳ یہ فقو اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ جن حاضرین دربار نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تھا، ادباً بہرین لوگوں تک اس کی معتبر خبریں پہنچی تھیں ان کے عقیدے اپنے دینِ آباؤی پر سے متنزل ہوئے جا رہے تھے، اولاً ان کے دین کا دار و مدار بس اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادوگر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت سے خود ایک فیصلہ کن مقابلہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے بیٹھے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات ٹھٹھانے پھرتے تھے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو ہم موسیٰ کے دین میں جاننے سے بچ جائیں گے۔ دہن بدلے دین و ایمان کی خیر نہیں ہے۔
۲۴ یہ تھے وہ حامیانِ دینِ مشرکین جو موسیٰ علیہ السلام کے حملے سے اپنے دین کو بچانے کے لیے اس فیصلہ کن مقابلے کے وقت ان پاکیزہ جذبات کے ساتھ آئے تھے کہ ہم نے پالا مار لیا تو سرکار سے کچھ انعام مل جائے گا۔

۲۵ اور یہ تھا وہ بڑے بڑے ابرو جہانِ خاوانِ دین و ملت کو بادشاہِ وقت بت ہوں سے مل سکتا تھا۔ یعنی روپیہ پیسہ ہی نہیں ملے گا، دربار میں کسی بھی نصیب ہو جائیگی۔ اس طرح فرعون اور اس کے ماحولوں نے پہلے ہی مرحلے پر نبی اور جادوگر کا عظیم خلتاتی فرق خود کھول کر رکھ دیا۔ ایک طرف وہ حوصلہ تھا کہ بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے ایک الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں دربانہ آکھڑا ہوتا ہے اور دھڑتے کے ساتھ کہتا ہے کہ میں اللہ رب العظیم کا بھیجا ہوا ہوں، بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر۔ فرعون سے دو بدلہ و بھت کرنے میں وہ ادنیٰ سی جھجک بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کو وہ پیر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ دوسری طرف یہ کم حوصلگی ہے کہ اسی فرعون کے ہاں باپ دادا کے دین کو بچانے کی خدمت پر بلائے جا رہے ہیں، پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار، کچھ انعام تو مل جائے گا نا، اور جواب میں یہ سن کر چھوٹے نہیں سماتے کہ پیسہ بھی ملے گا اور قربِ شہابی سے بھی سرفراز کیے جائیں گے۔ یہ دو مقابل کے کردار آپسے آپ باہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں جادوگروں کی کیا ہستی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شخص بے جہائی کی ساری حدوں کو نہ پھانڈ جائے، وہ نبی کو جادوگر کہنے کی جرات نہیں کر سکتا۔